ڈاکٹر ناہید ناز
اسسٹنٹ پروفیسر
گورنمنٹ کالج فار وومین، اٹک

اسطورہ اور ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانے

Myth is a story whose truth cannot be proved on logical or rational basis. It is an interesting fact that the multi-dimensional creative personality of Dr. Saleem Akhtar is as such that there is an aspect of his interest in mythical traditions. His keen interest in myth can be an influence of Carl Gustov Jung's Archetypes and it can also be on affect of the supernatural incidents which he used to listen from his mother in his childhood. His interest in myth has been integrated in his fiction symbolically. This article is an attempt to peep into mythology in his fiction.

لفظ اساطیر کا مادہ، عربی زبان کا لفظ ''سَطَر'' ہے۔[1] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مطابق اساطیر، کسی سماجی رسم یا عقیدے کا ازمنہ قدیم کی کسی بہتر، زیادہ اعلیٰ اور زیادہ مافوق الفطرت حقیقت میں سراغ لگا کر اسے مستحکم بناتی اور اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتی ہے۔[2] اساطیری قصّے کہانیاں اس کائنات میں افسانوں کا قدیم ترین روپ ہیں۔لفظ اساطیر کے تہذیبی پس منظر اور مفہوم کے متعلق ڈاکٹر قاضی عابد بیان کرتے ہیں:

> ''اسطورہ'' کے معانی ایک ایسی کہانی کے ہیں جس کی سچائی کو عام طریقوں سے ثابت نہ کیا جا سکے جب کہ Muthos اور Logos کے تال میل سے جنم لینے والا لفظ Myth بھی کم و بیش انہیں معنی میں استعمال ہوتا ہے۔اِسے بالعموم ایسی کہانی تصور کیا جاتا ہے جس کی واقفیت اس ثقافت کے لوگوں کے عقیدے، ایمان یا روایت کا اس طرح سے اٹوٹ حصّہ ہو کہ اس ثقافت سے متعلق لوگوں کی اکثریت اس کی واقفیت یا سچائی کو زیرِ بحث نہ لاتی ہو۔[3]

بالفاظ دیگر اسطورہ ایسی کہانی ہوتی ہے جس میں دیوی دیوتاؤں یا ان کی نمائندہ یا قائم مقام شخصیتوں کے اوصاف، فضائل یا کارنامے بیان کیے جاتے ہیں یا پھر مذہبی روایات و عقائد سے متعلق کہانیاں جن میں مافوق الفطرت عناصر یا ماورائی نوعیّت کے تجربات کو بیان کیا گیا ہو۔

دنیا کی تمام تہذیبوں میں اساطیری روایات موجود ہیں۔ ہندی، ایرانی، یونانی، رومی اور مصری دیومالاؤں میں مختلف اساطیر موجود ہیں، جن میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے۔اگرچہ یہ اساطیر خاصی حد تک معدوم ہو چکی ہیں، لیکن قصے کہانیوں میں ضرور زندہ ہیں۔ ہندوستان کا قدیم ترین اسطوری ادب ویدوں، پرانوں اور اپنشدوں میں موجود ہے اور بعد کے ادب عالیہ ''رامائن'' اور ''مہابھارت'' کے لیے مآخذ کا کام کرتا ہے۔ان اسطوری کرداروں میں بھرت، لچھمن، بھیم،

ارجن، کرشن اور ابھیمنیو خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ گویا اساطیر کسی بھی معاشرے کے مذہب، کلچر، اخلاقیات اور روحانی عقائد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بقول شہزاد سلیم:

> اسطوری کرداروں میں آپسی محبت ونفرت، جبر واختیار اور بقا وفنا کے مسائل بھی ہوتے ہیں جن کے بسبب خداؤں یا دیوی دیوتاؤں کا یہ سلسلہ فانی انسانوں کی زندگی کا عکس معلوم ہوتا ہے۔ اسی بنا پر فلسفیوں نے اساطیر کو انسانی فکر وآگاہی کا عکس کہا اور ان کے مافوق الفطرت ہونے کی خصوصیت کی تردید کی ہے۔[۴]

اس طرح تہذیبوں کے یہ اساطیر مختلف النوع قصّوں، کہانیوں اور حکایات کی صورت میں بنی نوع انسان میں نسل درنسل اجتماعی لاشعور کی صورت میں پروان چڑھتے رہے ہیں۔ انسان دراصل کسی بھی الوہی ہستی کو مجرّد کی بجائے مجسّم صورت میں دیکھنے کا تمنائی ہوا تو نتیجتاً اساطیر نے جنم لیا۔ کہیں دیوی دیوتا کی صورت میں تو کہیں مناظرِ فطرت کی صورت میں۔ ''ایکو'' حسین دوشیزہ اور ''نرگس'' حسین نوجوان بنا، یوں انسان کا اجتماعی لاشعور اساطیری کتھاؤں کی تخلیق کا باعث بنا۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانوں میں اساطیری روایات کا گہرا رنگ نظر آتا ہے جو اُن کی اساطیر، اینتھراپولوجی اور پیرا سائیکالوجی میں گہری دل چسپی کا نتیجہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> میری ذہنی دل چسپی کا دائرہ خاصا وسیع ہے، اساطیر، اینتھراپولوجی، آکلٹ، جادو اور پیرا سائیکالوجی وغیرہ کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔۔۔ میرے کئی افسانوں کی اساس اساطیر اور آکلٹ پر استوار ہے۔[۵]

اساطیری روایات سے ڈاکٹر سلیم اختر کا اوّلین تعارف، وہ قصّے کہانیاں ہیں جو اُن کی والدہ بچپن میں دل چسپ اسلوب میں انھیں سنایا کرتی تھیں۔ اُن میں سے بیش تر اُن کی والدہ کے اپنے بچپن کی سچّی کہانیاں تھیں جن میں راتوں کو جنات کے بچوں کا اُن کے ساتھ کھیلنا، والدہ کی رہائش گاہوں میں پچھل پائیوں، جن بھوت، چھلاوؤں کا آباد ہونا، زبان دراز بدکار عورت کی قبر سے شعلوں کا نکلنا اور عورت کا بلند آہنگ آواز سے چیخنا وغیرہ وہ ڈراؤنے قصے ہیں جو سلیم اختر نے بچپن میں اپنی والدہ سے سنے۔ ابتدائی بچپن کے یہ قصّے، اساطیر سے اُن کی دل چسپی کے اوّلین محرکات ثابت ہوئے جنھوں نے اُن کے جذبۂ تجسّس اور قوّتِ تخیّل کو پروان چڑھایا اور وہ اُن کے لاشعور کا حصّہ بنے، وہ لکھتے ہیں:

> یہ واقعات میرے تحت الشعور میں محفوظ رہے اور بعد میں جب علمی سطح پر اشیا اور واقعات کو سمجھنے کی کاوشوں کا آغاز ہوا تو مَیں نے مافوق الفطرت جادو اور اس سے متعلقہ افعال واشغال کو انگریزی میں اچھی کتابوں کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کی۔ مَیں زندگی میں فلسفہ، منطق، عقل اور سائنس کا بہت زیادہ قائل ہوں لیکن اب بھی ذہن کا ایک گوشہ ان غیر عقلی اور غیر منطقی واقعات سے وابستہ تحیّر کا اسیر ہے۔ شاید اس لیے کہ مَیں نے اندر کے اُس بچّہ کو جذباتی لحاظ سے پال پوس کر تروتازہ رکھنے کے لیے اسے پروفیسر نقاد کے سایہ سے بچائے رکھا۔ مَیں نے پچھل پائیوں، آسیب، روحوں، ویمپائر، کالے جادو یا مافوق الفطرت سے وابستہ خوف پر بعض افسانے لکھے، جو جدید افسانوی رجحان سے لگا نہیں کھاتے تو اس کا باعث یہی ہوسکتا ہے کہ میرا تحت الشعور

بچپن کے ان واقعات کے سحر سے آزاد نہیں ہو سکا۔[۶]

مافوق الفطرت عناصر اور اساطیری روایات انسانی تہذیب کا لازمی حصّہ رہی ہیں جن کا اظہار مختلف اقوام میں مختلف انداز سے ہوا ہے اور ہر قوم نے اپنے مذہبی عقائد و تصورات کے مطابق اپنی زندگی اور فنون کا بھی لازمی حصّہ گردانا ہے ،جس کا سلسلہ تا حال بدستور جاری ہے، بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> آج اگر اساطیر علم الاقوام کے مباحث یا مردہ مذاہب کی صورت اختیار کر چکی ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ اب واقعی ''مردہ'' ہے۔اساطیر ان معنوں میں کبھی بھی نہیں مر سکتی کیوں کہ سائنسی اور عقلی ترقی کے باوجود بھی آج کے انسان کے لیے کسی نہ کسی اسطورہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔گو آج کا مہذب انسان شعوری طور سے دیوتاؤں اور ان کے کارناموں کو محض داستانِ پارینہ سمجھتا ہے لیکن بقول الڈس ہکسلے ''اب بھی اسطور موجود ہیں اور وہ انسانی ذہن کے کسی روپوش گوشے کے لیے اب بھی کشش رکھتے ہیں۔''[۷]

ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانوں میں اساطیری علامات ہیں جن کے ذریعے انھوں نے ماضی اور حال سے استعاراتی روابط جوڑتے ہوئے گزشتہ کل، آج اور آنے والے کل کے ساتھ خوب صورت ربط قائم کیا ہے؛ وہ لکھتے ہیں:

> نئے استعارات اور علامات کی تخلیق کے ساتھ ساتھ اساطیر اور داستانوں سے بھی اپنے لیے علامات حاصل کر کے کل کے انسان اور آج کے انسان کے درمیان زندگی کے معانی کی وحدتِ نو کی تشکیل کی۔[۸]

ڈاکٹر سلیم اختر کے اساطیری روایات پر مبنی افسانے اُن کے لاشعور کا تخلیقی اظہار ہیں جن میں یونانی ،عربی ، ہندی اساطیری روایات کا رنگ نمایاں ہے۔ وہ نفسی افسانوں کے ساتھ ساتھ اِن اساطیری افسانوں کو اپنا تخلیقی سرمایہ گردانتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں ''معاصر افسانہ نگاروں میں سے شاید ہی کسی نے اساطیر، جادو، ابلیس پرستی، دیمپائر پر اتنے افسانے لکھے ہوں گے۔اِن افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ کرنے والے نقاد کا ہنوز منتظر ہوں۔''[۹]

ڈاکٹر سلیم اختر کے اکثر افسانوں میں کہیں نہ کہیں اساطیری حوالہ آ جاتا ہے لیکن جن افسانوں میں کُلی طور پر اساطیری روایات اور رجحانات موجود ہیں اُن میں ''قفسِ رنگ''، ''تذکرہ اشجار''، ''شجرِ سنگ بار''، ''جنم رُوپ''، ''بَن آتما''، ''پکار''، ''شکتی''، ''اماوس''، ''جنوں کی رات''، ''سائے کی طرح ساتھ پھریں'' اور ''پھن پھول'' شامل ہیں۔طویل مختصر افسانہ ''قفسِ رنگ'' ایک نو آموز مصوّر کے احساسات و جذبات پر مبنی ہے جو اُسے ایک حسین دوشیزہ کی تصویر بنانے کے دوران پیش آئے۔افسانے کا آغاز ایک تاریخی واقعے سے ہوتا ہے۔جب ایتھنز (یونان) میں فرائی نی (Phryne –Frine) نامی ہتیاری (طوائف)، ہر کسی ٹیلز کی تراشیدہ افرو ڈائٹی کے لیے ماڈل بنی تھی۔فرائی نی کی حالاتِ زندگی اور حسن و جمال کے بارے میں ابنِ حنیف لکھتے ہیں:

> وہ چوتھی صدی قبل مسیح میں یونان کے مشہور ڈیرے دار طوائف تھی۔اتنی خوب صورت کہ یونانِ قدیم کے معروف اور نامور مصور

ایلپس نے بھی اپنی سب سے مشہور تصویر ''افروڈائٹی آف ایلپس'' کے ماڈل کے لیے فرائی نی کو ہی منتخب کیا۔ اِس تصویر کو (Anadyomene Venus) کا نام بھی دیا گیا۔ اِس میں ایلپس نے افروڈائٹی کو سمندر سے نمودار ہوتے دکھایا۔ اِس عالم میں کہ وہ اپنے بالوں کو نچوڑ رہی ہے، اس طرح نیچے گرنے والے آبی قطروں سے حسن وعشق کی دیوی کے خوب صورت جسم کے گرد نقرئی لیکن ایسا شفاف پردہ بن گیا ہے جس کے آر پار دیکھا جا سکتا ہے۔ یوں فرائی نی کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ قدیم یونان کے دو مصوروں کے لیے ماڈل بنی۔ فرائی نی، ہر کسی ٹیلر کی محبوبہ بھی تھی۔ ہر کسی ٹیلر نے اس کا خالص سونے کا مجسمہ بنایا۔ مجسمہ بنانے کے بعد اس پر ملمع کاری بھی کی اور یہ مجسمہ ڈلفی (سب سے بڑے مذہبی مرکز) میں رکھا گیا۔[۱۰]

افسانے میں جس مقدمے کا ذکر ہے وہ بھی سچّا واقعہ ہے اور تاریخ سے ثابت ہے۔ جب ایتھنز کی اس حسینہ پر بدعقیدہ ہونے کے الزام میں مقدّمہ چلایا گیا تو وہ محض اپنے حسن کی بِنا پر مقدّمہ میں بَری ہوئی۔ ایتھنز کے جمال پرست مقرر، ہائپرائیڈیز (Hyperides) جو بعد میں کامیاب وکیل بنا، نے اُسے فنا ہونے سے بچالیا۔ افسانے کا یہ منظر ملاحظہ کیجیے:

> دیکھیے! خوب صورت جسم دیکھیے، ایتھنز میں آپ اپنی مثال، مرمر کا یہ مکمل ترین پیکر دیکھیے۔ مسئلہ یہ نہیں کہ اُس پر قتل کا الزام ثابت ہوتا ہے یا نہیں، اصل مسئلہ یہ ہے کہ کیا زیوس کے ہاتھوں تراشا ہوا یہ مکمل ترین پیکر فنا کر دینے کے لائق ہے؟[۱۱]

افسانے میں نوآموز نوجوان مصوّر کی نفسی جذبی کیفیات، اس کا جوشِ جنوں، انہماک، وارفتگی اور اضطراب بھری کیفیات اِسے نفسیاتی افسانوں کے قریب لے جاتی ہیں۔ جس میں کارل گستاؤ یونگ کی نخستمثال (Archetype) ''مادرِ عظمیٰ'' کا سلبی پہلو سامنے آتا ہے۔ جب تصویر میں ایک خون آشام نظر آتی ہے اور وہ حسین دوشیزہ، مرد مار بن جاتی ہے حتیٰ کہ وہ مصور کا خون کر دیتی ہے اور یوں اپنے حسن کا خراج انسانی خون کی صورت میں وصول کرتی ہے۔ افسانے کا اختتام، مادرِ عظمیٰ کے سلبی پہلو کی غمازی کرتا ہے، جب وہ حسین دوشیزہ، جوشِ جنوں میں ڈوبے مصوّر کو قتل کرتی ہے یہ اختتامی منظر نامہ ملاحظہ کیجیے:

> صبح کی پہلی کرن نے روشن دان سے نیچے کمرے میں جھانکا! پینٹنگ میں خون آشام یوں منہ کھولے، گویا ابھی ابھی آخری نوالہ نگلا ہو، لہو کے چند قطرے سرخ ہونٹوں سے لکیر بناتے، ٹھوڑی تک آ گئے تھے، سامنے کے دانتوں میں گوشت کے ریشے چمک رہے تھے۔ ایزل کے سامنے مصوّر!! سینہ پر گہرے گھاؤ کے اندر دل ساکت، قطرہ قطرہ رستا خون، ایک ہاتھ میں لہو رنگ موقلم یوں اٹھا گویا تصویر کے نیچے دستخط کرنے کو ہو، ہونٹوں پر طمانیت کی مسکراہٹ، نیلی آنکھوں کی پتلیوں میں ایزل کی پینٹنگ چمک رہی تھی۔[۱۲]

گویا عورت ایک پراسرار ہستی ہے جس کا بھید پانا مرد کے بس کی بات نہیں۔ مصوّر سارے افسانے میں یہی راز تلاش کرتا رہا اور اسی میں جان دے دی۔ جان دینے کے بعد ''ہونٹوں پر طمانیت کی مسکراہٹ'' سے مراد یہ کہ اس کا اضطراب موت کے بعد طمانیت میں بدل گیا اور اُس نے زندگی کی قیمت دے کر عورت کا راز پالیا۔ تصویر مکمل ہوگئی اور دستخط

کے لیے ''ایک ہاتھ میں لہو رنگ موقلم اٹھا'' کہ یہی آخری کام تھا۔''قفسِ رنگ'' میں افسانہ نگار نے بیک وقت جنس ،نفسیات اور اساطیری روایات کا امتزاج پیش کر کے افسانے کی دل کشی اور تاثیر کو دو چند کر دیا۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے اساطیری افسانوں میں شجر کا اسطورہ بدی کے خلاف ردِعمل اور عدل وانصاف کے حصول کے لیے علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔''تذکرہ اشجار''،''شجر سنگ بار''جیسے افسانوں میں شجر بطورِ منصف اور خیر کے استعمال ہوا ہے۔شجر کا اسطورہ عہدِ قدیم سے داستانوی ادب میں مستعمل رہا ہے۔

داستانوی اسلوب میں تحریر کردہ افسانہ ''تذکرہ اشجار'' قدیم مخطوطے کی تکنیک میں لکھا گیا ہے تا کہ افسانے میں حقیقت کا رنگ بھرا جا سکے۔یہ کہانی ایک بادشاہ اور اس کے وقائع نگار کے گفت وشنید پر مبنی ہے جن کی مشترک صفت علم دوستی ہے۔دونوں ہر شام'' کجلی بن'' کی سیر کو نکلتے ،درختوں کے سائے تلے مختلف النوع کتب کا مطالعہ کرتے۔وقائع نگار، بادشاہ وقت کا پشتینی غلام تھا۔اُس کے غلام باپ نے اُسے دربارِ شاہی میں رہنے اور بادشاہِ وقت کی نگاہوں میں باوقار رہنے کے لیے کچھ نصیحتیں کی تھیں اور وہ وقائع نگار باپ کی نصیحتوں کی مجسم تصویر تھا۔سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا کہ اچانک درباری سازشیں عود آئیں اور ایک ''زن ناہنجار'' کو بادشاہِ وقت کو پھانسنے پر معمور کر دیا گیا۔برق گزیدہ درخت کے سائے تلے بیٹھی حسینہ پر بادشاہِ وقت فریفتہ ہوا لیکن عین اگلے لمحے ،طے شدہ منصوبے کے مطابق اُس کے اوپر بھاری درخت گروا کر اُسے قتل کر دیا گیا۔دربار میں نئے بادشاہ کا اعلان ہوا،کورنش بجالائے گئے ،دربار کے امرا،وزرا،عمائدین اور اراکین حتیٰ کہ قصیدہ گو شعرا کی ابن الوقتی ثابت ہوگئی۔بادشاہ کے بدلتے ہی سب کے دل ودماغ اُسی کے مطیع ہو گئے۔سب خوش تھے لیکن زنِ ناہنجار خوش نہ تھی کیوں کہ وعدے کے مطابق بادشاہ سے عقد کی خواہاں تھی جب کہ نیا بادشاہ مشرقی سرحدیں محفوظ بنانے کے لیے پڑوسی ملک کی قبیح صورت لڑکی سے عقد کرنا چاہتا تھا کہ یہاں سیاسی مصلحت آڑے آ رہی تھی۔پھر ایک شام کو نیا بادشاہ اور زن ناہنجار ہنستے کھیلتے کجلی بن کے اُس مقام پر پہنچے جہاں بادشاہِ وقت کو قتل کیا گیا تھا۔یہاں کھڑے درخت نے اساطیری روپ بھرا اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں کو اُچک کر اپنے وجود میں سما لیا۔

یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ انسانی سازشیں،مکر وفریب اور دھوکہ دہی اپنی جگہ،لیکن ایک مقام ایسا آتا ہے جب فطرت جوش میں آتی ہے اور تمام سازشوں کا خاتمہ کر دیتی ہے۔فطرت کے انتقام کی طاقت ،بندے کے مکر وفریب سے کہیں زیادہ ہے۔یہاں درخت کا اساطیری روپ بھر کر دونوں کو اُچک لینا اور سیاہ چیونٹیوں کا ان کی نعشوں کی طرف قطار میں جانا دراصل برائی کو ختم کرنے کا فطری انداز ہے۔آخری دو عبارات اساطیری عناصر سے بھر پور ہونے کی بنا پر افسانے کو اساطیری گروہ میں شامل کر دیتی ہیں۔یہاں شجر کا اساطیری روپ بھر کر دونوں کو نگلنا،گویا بدی کی طاقتوں کو سلب کرنا ہے جب کہ ''شجر سنگ بار'' میں شجر بستی کے ناانصاف اور ظالم لوگوں پر سنگ باری کرتا ہے جو منافقت کی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں اور نام نہاد نیک طینتی کے بل پر بستی میں موجود ناکتخدا کو زنا کے جرم میں سنگ باری کی سزا دیتے ہیں اور اس کے لیے بستی

کے مرکز میں عالی شان درخت کا انتخاب کرتے ہیں۔عورت اوراس کے شریک جرم مرد کو سنگ بار کیا جاتا ہے تو درخت کے پتے ، شاخیں اور ٹہنیاں پتھر میں تبدیل ہو کر بستی کے سارے لوگوں پر سنگ باری شروع کر دیتی ہیں۔شجر کے یہ دونوں اساطیری روپ دراصل بدی کے خلاف فطرت کی طاقت کے علاحدہ علاحدہ روپ ہیں جسے ڈاکٹر سلیم اختر نے خوب صورت اسلوب میں ڈھال کر دل چسپ بنا دیا ہے اوراس کی تفہیم میں دشواری نہیں رہتی۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے اساطیری افسانوں میں جن ،بھوت ،ڈائن ، چڑیل(Vampire) جیسے خون خوار اور مردم خور جیسے اساطیری کردار بھی نظر آتے ہیں۔مردم خوری کی کہانیاں''بن آتما''،''پکار''، ''شکتی''جیسے افسانوں میں بیان کی گئی ہیں۔''بن آتما''(جنگل کی روح) میں مردم خور چڑیل کا روپ بدلنا، جان دار کے سینے یا شہ رگ میں دانت گاڑ کر اُس کا خون چوسنا قدیم اساطیری روایات کا حصہ ہے۔یہ افسانہ ہندی اسلوب میں لکھا گیا ہے کیوں کہ ہندی دیو مالا میں بھوت پریت ،جنوں پریوں ، چڑیلوں، پچھل پائیوں اور آ گیا بیتال کے اساطیر پر مبنی کہانیاں عام ہیں اوراُن کے جادوٹونوں کا توڑ مہا پجاری کرتے ہیں۔ افسانے کو موضوع اور مضمون کے مطابق ہندی اسلوب دے کر فطری رنگ پیدا کیا گیا ہے۔افسانے میں چیت، پاپ،شریر،تن نگرا، بیاکل، رکھشا،اشنان، مدھ بھرا، لابھ، بدھ، بھوگ، اپائے جیسے ہندی الفاظ، ہندی ماحول کی حقیقی ترجمانی کرتے ہیں۔مہا پجاری کے جاپ والے منظر میں''گیندے کے پھولوں کے ہار''اور''تلسی کی شاخوں کا ہاتھ میں لینا''ہندی اساطیری انداز ہے۔اِن تینوں کے تقدس کا جواز ہندو دیو مالا میں ہے۔ہندو مذہب میں پیپل کا درخت،تلسی کا پودا اور گیندے کا پھول مقدس ہیں:''اوّل الذکر، ویشنو کا پودا ہے جب کہ موخرالذکر پر تمام دیوتاؤں کا بسیرا ہی نہیں ہوتا بل کہ ایک مخصوص مہینہ میں ویشنو ایک ماہ کے لیے پیپل بن جاتا ہے۔''[۱۳] افسانہ نگار نے ہندی روایات کے لیے ہندی پیرائیہ ادا کا برمحل استعمال کر کے افسانے کو دل کش بنا دیا ہے۔

اِس افسانے میں چڑیل،سندر نار کے روپ میں تھی،جس کی کشش نے راجہ کو اپنی رانیوں سے بے زار کر دیا تھا۔وہ جون بدلتی رہی اور جنگل کے چرند پرند کھا گئی حتیٰ کہ بھرے جنگل میں جانوروں اور پرندوں کی آوازیں تک نہ رہیں اور جب محل کا رخ کیا تو مرد و زن کو کھا گئی۔ڈاکٹر نجیب جمال اِس افسانے پر یوں تبصرہ کناں ہیں:

> یہ کہانی ڈاکٹر سلیم اختر کی بیک وقت مافوق الفطرت اور انڈیا لوجی سے دل چسپی کا مظہر ہے۔مہابھارت کی طرز میں لکھی گئی اِس مختصر کہانی میں قدیم ہندوستانی ماحول، راجوں مہاراجوں کا مزاج، مہامنتریوں کی وفاداری،،مہا پجاری کے بھوج پتروں اور منتروں کا ذکر فنکارانہ چابک دستی کے ساتھ کیا گیا ہے،اِس افسانے میں قدیم قصوں میں مذکور بے کل آتما کو آدم خور عورت کا روپ دے کر کہانی کا تانا بانا بُنا گیا ہے۔[۱۴]

چڑیل(Vampire) کے موضوع پر دوسرا افسانہ''پکار''ہے۔جس میں چڑیل مُردوں کا خون چوستی ہے اور اگر وہ زندہ انسان کا خون چُوس لے وہ موت کے بعد خود Vampire میں تبدیل ہو جاتا ہے۔اُس چڑیل کی موجودگی کی وجہ سے

بستی خوف و ہراس کا شکار ہے۔ وہ شکلیں اور جَون بدل کر آتی ہے، کبھی چوہا، کبھی بھیڑیا اور کبھی مرد کا روپ دھار لیتی ہے۔ بستی سے دُور قبرستان میں اُس کا قیام ہے، لہسن کی بو اُس کے لیے ناگوار ہے۔ محبوبہ، عاشق سے ملنے کے لیے بے تاب ہے، مگر چڑیل عاشق کا روپ دھار کر ہیولے کی طرح آتی ہے اور محبوبہ کی گردن میں اپنے دانت پیوست کر کے خون چوس لیتی ہے اور دانتوں کے نشان، دو سوراخوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں؛ حتیٰ کہ وہ اس چڑیل کے ذائقے کی ایسی عادی ہو جاتی ہے کہ اس کا انتظار کرنے لگتی ہے۔ عاشق، اُس چڑیل کو مارنے کی ترکیب پر عمل پیرا ہوتا ہے اور بڑھیا کی بتائی ہوئی ترکیب پر عمل کرتے ہوئے زہر کا پیالہ محبوبہ کو پلانے کے لیے جاتا ہے۔ لیکن جب وہ اس کے قریب جاتا ہے تو وہ چڑیل بن چکی ہوتی ہے اور وہ اس کی دل فریب مسکراہٹ کا اسیر، اُس کے آہنی ہاتھوں اور باریک تیز دھار دانتوں کا قیدی بن چکا ہوتا ہے۔ اُس کے تیز دانت اس کی گردن میں دو سوراخ بنا چکے ہوتے ہیں۔

چڑیل کے اسطورہ پر مبنی افسانے ''شکتی'' میں عورت چڑیل کے روپ میں ہوتی ہے اور مرد کو اپنا شکار بنا کر اُس کی وجاہت، طاقت اور تر و تازگی سلب کر لیتی ہے۔ نقاہت زدہ جسم میں گوشت کی جگہ ہڈیاں رہ جاتی ہیں اور اس کا چہرہ شکنوں سے بھر جاتا ہے۔ گویا وہ چڑیل مکمل طور پر اس پر غالب آ چکی ہوتی ہے۔ جنگل باس میں چوکڑیاں بھرتی ہرن (چڑیل) نے جَون بدلا تو اگلے لمحے خوب صورت دوشیزہ کے روپ میں سامنے آئی اور اس کا سینہ چیر کر دل نکال کر چبا لیا۔ یہ سارا عمل چند ہی ساعتوں میں مکمل ہوا اور ایک جیتا جاگتا مرد، بکھری ہوئی لاش میں تبدیل ہو گیا جب کہ چڑیل کو اس سے نئی توانائی ملی اور وہ ''شکتی وان'' بن گئی:

> عورت کام ختم کر کے جب جسم پر سے اٹھی تو گویا اٹھتی ہی چلی گئی۔ آنکھوں کے جگنو اب شعلوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ ماتھے پر نئی جوانی کی لَو تھی تو ہونٹوں پر سرخی کا تاج۔ اُس نے بھرپور انگڑائی لی تو محسوس کیا وہ سارا جنگل اپنے بازوؤں میں لے کر اُسے مروڑ سکتی ہے۔ اُوپر چاند کو دیکھا تو سوچا وہ جب چاہے اُسے توڑ کر نیچے پھینک سکتی ہے۔ وہ شکتی وان تھی![15]

افسانہ ''شکتی'' میں عورت کی مردم خوری کے حوالے سے صباح مقبول حسن رقم طراز ہیں:

> ''شکتی'' اِسی بنیاد پر لکھا گیا افسانہ ہے کہ عورت مختلف طریقوں سے مرد کو کھاتی اور اسی سے اپنے حسن اور کشش میں اضافہ کرتی ہے۔ وہ شکتی جو مرد کی پہچان ہے وہ شکتی عورت اس سے حاصل کر لیتی ہے اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا ہے۔ ایک مرد کے بعد دوسرا مرد![16]

''بن آتما''، ''پکار'' اور ''شکتی'' کی طرح افسانہ ''جُنوں کی رات'' بھی چڑیل (Vampire) کے موضوع پر ہے مگر اِس افسانے میں چڑیل عورت نہیں بل کہ مرد بُھوت پریت کا روپ دھارتا ہے اور عورت خود سپردگی کی علامت ہے جو مرد کے جوشِ جُنوں کی تسکین کرتی ہے، نہ صرف مرد کے لیے شادابی اور سیرابی کا باعث بنتی ہے بل کہ جذامی زمین کا نکھار بھی اُس عورت کے مرہونِ منّت ہے۔ داستانوی اسلوب پر مبنی یہ افسانہ عورت کی ایثار پسند فطرت کا غماز ہے جو اپنا وجود ختم کر

دیتی ہے لیکن کائنات کو سرشار رکھتی ہے۔

یورپ میں شیطان کی پُوجا (worship of devil) باقاعدہ اساطیری روایات کا حصہ ہے جس میں گدھا، شیطان کا مقرب (داروغہ) ہوتا ہے۔ شیطان کی پوجا کی باقاعدہ تہذیبی حیثیت ہے اور Baby,s' Rosemary Exorcist جیسے ناول (جو بعد میں فلمیں بنیں) اِسی موضوع پر لکھے گئے تھے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے ''اماوس'' نامی افسانہ اپنے ابتدائی کنڈیشنگ کے تحت پر قلم بند کیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> قریبی دوستوں کو بھی یہ علم نہیں کہ مَیں خوفناک کہانیوں اور ہورر موویز کا رسیا ہوں۔ مَیں نے بروم سٹوکر کے ''ڈریکولا'' کا مطالعہ اس وقت کیا جب میں کالج میں تھا اسی لیے اگر میں نے شیطان کی پوجا کے موضوع پر افسانہ ''اماوس'' قلم بند کیا تو یہ باعث، تعجب نہ ہونا چاہیے کہ میری ابتدائی کنڈیشنگ کا یہی تقاضا تھا۔ ۱۷

افسانہ ''اماوس'' میں ایسی تقریب کی منظر کشی کی گئی ہے جس میں شیطان کے سامنے تحفے تحائف پیش کیے جاتے ہیں۔ بدی کی طاقتیں اپنی بری خواہشات کی تشفّی کے لیے شیطان کے سامنے کھڑی ہوتی ہیں۔ نوزائیدہ بچّے کو اس کے قدموں میں پیش کیا جاتا ہے اور شیطان پوری طاقت سے اُس بچّے کے سینے میں خنجر گھونپنے کو ہی ہوتا ہے کہ اس کی طاقت سلب ہو جاتی ہے، گھپ اندھیرا چھٹ جاتا ہے، اماوس کی تاریک رات میں چودھویں کا چاند اُبھرتا ہے، تاریکی نور میں بدل جاتی ہے۔ بُرائی کی طاقتیں مسدود ہو جاتی ہیں اور نیکی کی قوتیں غالب آ جاتی ہیں۔ بچّہ نیا روپ جنم لیتا ہے جو نیکی کی قوت پر مبنی ہوتا ہے۔ یہاں افسانہ نگار بھوت پریت، چڑیلوں، پچھل پائیوں، آگیا بیتال کے روپ میں بدی اور شر کی طاقتوں کا خیر کی قوّت کے ساتھ کش مکش دکھاتا ہے اور آخر میں خیر کی قوت کو غالب پاتا ہے۔ یوں ماضی اور حال کے تناظر میں مستقبل کی پیش بینی خوب صورت اساطیری انداز میں کر دیتا ہے۔ افسانہ ''اماوس'' میں اُلو، چمگادڑیں، بچھو، سیہہ، بُھوت، پچھل پائیاں، آگیا بیتال بدی کی جب کہ نوزائیدہ بچّہ نیکی کی علامت ہے۔ نیکی، بدی پر غالب آ گئی، یقیناً کامیابی حق ہی کی ہوتی ہے۔ افسانے کا یہ منظر نامہ ملاحظہ کیجیے:

> مقرّب کا ہاتھ بلند ہوا۔ پھر اُسے آنکھوں کے نیچے ہوتے دیکھا اور پھر اچانک وہ نوزائیدہ بچّہ جو مُردہ تھا، کھلی آنکھوں سے زور سے ہنسا، اس کے قہقہے نے فضا کو لرزا دیا اور عین اُسی لمحے اندھیرے کی گھٹا، جیسے چھٹ گئی اور چودھویں کے چاند نے فضا کو نور کا غسل دے دیا۔ پہلے مقرّب تڑپ کر گرا اور پھر ایک ایک کر کے وہ یوں گرے جیسے لاکھ کے پتلے آگ کے شعلوں میں بہتے جائیں۔ ۱۸

ہندی اساطیر میں دیوتا ''شیو'' کا کردار ''پھن پھول'' نامی افسانے میں آیا ہے۔ شیو دیوتا کی پسلی سے ناگن پیدا ہوئی۔ شیو دیوتا کے حوالے سے ابنِ حنیف لکھتے ہیں:

> اشو، شیو یا شیوا (Shiva) ہندوؤں کی سب سے اہم مشہور ترین تر مورتی کا رکن ہے۔ اِس تر مورتی میں برہما دیوتا، وشنو دیوتا اور شیو دیوتا شامل ہیں۔ اگرچہ شیوا اور ویشنو اِس تر مورتی میں اکٹھے ہیں مگر دونوں کے لیے اپنے اپنے فرقے اور مذہبی عقیدے

میں شدید اختلافات ہیں۔ شیو کے معنی ''مبارک'' کے ہیں جب کہ ''موافق، مہربان، نیک دل، شفیق، روشن اور مسرور'' اسی کے معنی بتائے جاتے ہیں۔ مگر اس کے نام کے معنی کے برعکس، تباہ کاری شیو کا فریضہ ہے۔[۱۹]

سانپوں اور سپیروں پر مشتمل یہ افسانہ اپنے اندر تجسّس، تحیّر اور دل چسپی کے کئی عناصر رکھتا ہے۔ ناگن کا دیوتا کی پسلی سے پیدا ہونا، پھر اِسی دیوتا کے ساتھ رقص کناں ہونا، اس میں زبردست اساطیری قوتوں کی موجودگی، اُسی ناگن کا گائے کو ڈسنا اور گائے کا مر جانا اور پھر ایک بھوکے گدھ کا گائے کا زہریلا گوشت کھا کے مر جانا، جیسے واقعات کڑی در کڑی ایک دوسرے سے پیوست ہوتے ہوئے افسانے میں تحیّر اور دل چسپی کا اضافہ کرتے ہیں۔ دیوی دیوتاؤں کے مختلف اساطیری روپ اور مختلف تہذیبی مظاہر اور فنونِ لطیفہ میں ان کا اظہار ہندوستان کی قدیم ترین تاریخ کا حصّہ رہے ہیں جو آج بھی کروڑوں لوگوں کے عام زندگی کے معمولات کا حصہ ہیں۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> ہندوستان واحد ملک ہے جہاں پانچ ہزار برس پرانی اساطیر ان سے وابستہ عقائد اور ان سے جنم لینے والی رسوم اور توہمات کروڑوں افراد کی عملی زندگی میں موثر کردار ادا کر رہی ہیں۔ لگن کے لیے شبھ گھڑی کا تعیّن، کسی بڑے آدمی کا سو برہمنوں کو کھانا کھلانا اور کھاٹن کے لیے ناریل توڑنا، ٹیکسی ڈرائیور کا بجرنگ بلی کی تصویر لگانا، عمارتوں پر ''اوم'' لکھنا، سانپ کو دودھ پلانا۔ یہ سب اساطیری مظاہر ہیں جو ایک بھارتی کی زندگی میں یوں رس بس چکے ہیں کہ اس نے کبھی ان کی پانچ ہزار سالہ قدامت پر غور نہیں کیا ہوگا۔ اِسی اساطیری عمل نے تخلیقی اظہار پا کر رقص اور موسیقی (بالخصوص بھجن) کی صورت میں تہذیبی ورثہ کی صورت اختیار کر لی۔[۲۰]

افسانہ ''پھن پھول'' میں نصف اول (دیوتا کے ذکر تک) ہندی اسلوب اختیار دیا گیا ہے اِسی مناسبت سے ہندی اسلوب اور ہندی ماحول، افسانے کو فطری بنائے رکھتا ہے؛ جب کہ افسانے کا نصف آخر میں، اُردو الفاظ کے استعمال کے ساتھ سادہ اسلوب استعمال کیا گیا ہے۔ افسانے کا آخری نصف حصّہ، گدھ کی بھوک اور مردہ گائے کی بدبو دار نعش سے ہوتا ہوا، ایک بوڑھے اور ایک نوجوان (داتو) کے مشاہدے اور تجربے تک جا پہنچتا ہے۔ یہاں ناگن اساطیری صفات کی حامل ہے جو اپنی سحر انگیز بینائی سے داتو کو اپنا اسیر بنا لیتی ہے۔ حتیٰ کہ داتو کو اپنی محبوبہ (رینا) سے بے زار کر دیتی ہے۔ ناگن رینا کو مار دیتی ہے۔ لیکن داتو کو اس کا بھی کوئی افسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ اُسے عجیب سا سکون ملتا ہے۔ افسانے کے اختتام پر داتو اور ناگن کا ملن ہوتا ہے اور تمام وادی ''پھن پھول'' میں بدل جاتی ہے۔

یہ اساطیری افسانے مختلف علامات ہیں جو تلخ معاشرتی حقائق پر مبنی ہیں۔ یہ عفریتیں، بلائیں، چڑیلیں اور بھوت معاشرے کے عفریت زدہ سیاست دان، حکم ران اور عوام کا خون چوسنے والے راہ برنما، راہ زن ہیں جن سے بستی (ملک) کے لوگ خوف زدہ بھی ہیں اور بے زار بھی۔ بقول ڈاکٹر اے بی اشرف:

> پکار، لہو کی چپچپاہٹ، اماوس، شاہی دسترخوان، شکتی اور جنون کی رات، یہ سب کہانیاں دہشت ناک اور اور کریہہ المناظر ماحول

لیے ہوئے ہیں۔ یہ دراصل ہمارے اپنے معاشرے اور ماحول کی کہانیاں ہیں، جہاں مُلّاؤں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ جہاں لہو پینے والے عفریت ہیں۔ جہاں ظلم کے سائے ہیں۔ آمریت اور لاقانونیّت عام ہے۔ جہاں ڈرگ مافیا نے جال پھیلا رکھا ہے، سمگلنگ، کلاشنکوف، لوٹ مار، قتل وغارت اور استحصال کا دور دورہ ہے۔[۲۱]

یونانی، مصری، ایرانی، ہندی دیومالاؤں میں بھوت پریت اور چڑیلوں کے ساتھ ساتھ کالے جادو کا بھی زور رہا ہے۔ بقول ابواللیث صدیقی: ''ہر عہد اور ہر مذہب میں دنیا کے انسانوں کی ایک کثیر تعداد نے ہمیشہ جادو کے اثر کو تسلیم کیا ہے''۔[۲۲]

ہم شعوری طور پر ان کا یقین نہ بھی کریں لیکن یہ ہماری مذہبی زندگی کا ضروری حصہ رہی ہیں۔ قرآن پاک، انجیل، توریت، زبور، وید، بھگوت گیتا، پران، اوستا وغیرہ میں جادوٹونے کا تذکرہ ملتا ہے۔ لہٰذا یہ ہمارے اجتماعی لاشعور کا لازمی جزو بن چکا ہے۔ جادوٹونوں اور تعویذوں کے حوالے سے مولانا حسن نظامی دہلوی کی کتاب تاریخِ فرعون میں فراعنہ مصر کے تمدنی حالات کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

مصری گنڈے تعویذ بھی بہت استعمال کرتے ہیں، مگر سب کاموں کے برخلاف ان کے گنڈے تعویذ قسم قسم کے جانوروں اور کیڑوں کی صورت میں ہوتے تھے۔ بلی، کتا، بیل، مینڈھا، بندر، سور، اور خرگوش وغیرہ کی صورتوں کے گنڈے تعویذ بناتے تھے۔ زندہ بھی انھیں پہنتے تھے اور مردوں کو بھی پہنا کر دفن کرتے تھے۔ سانپوں سے مصری بہت ڈرتے تھے۔ اس لیے سانپوں سے بچنے کے لیے طرح طرح کے تعویذ بناتے تھے سانپوں کو صرف زندہ ہی کے لیے مہلک نہ سمجھتے تھے بلکہ مردوں کے لیے بھی، یہی وجہ ہے کہ لاش کو سانپ سے بچانے کے لیے بہت سے تعویذ قبر میں رکھ دیتے تھے (ص ۸۔۲۱۷)۔ قاہرہ کے عجائب گھر میں ہزاروں تعویذ موجود ہیں۔۔۔ آج کل (بھی) مصری تعویذوں سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں اور انھیں کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔[۲۳]

سائنس اور ٹیکنالوجی کی اِس حقیقت پسندانہ زندگی میں اِن علوم پر اعتقادات معدوم ہو چکے ہیں لیکن دنیا کے چند خطّوں مثلاً ایشیا، یورپ اور امریکہ جیسے عقل پرست ممالک میں بھی ایسے واہمے عام ملتے ہیں۔ جادوٹونے اور تعویذوں کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں کہ ''مسیح سے ہزاروں برس قبل کے انسان کی طرح آج کا مسلمان بھی تعویذوں (اور ان کے حصول کے لیے پیروں) سے آزاد نہ ہو سکا۔''[۲۴] اس کی وجہ جہالت، بے یقینی، اخلاقی پستی یا احتیاجات میں پھنسے ہوئے انسان کی فوری اور خاطر خواہ کامیابی کے متوقع ذرائع ہو سکتے ہیں۔

افسانہ ''سائے کی طرح ساتھ پھریں'' کالے جادو، تعویذ گنڈوں کے دام میں پھنسے انسان کی نفسی الجھنوں اور واہموں پر مشتمل ہے، جن کے زیرِ اثر وہ گھر کے افراد کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے اور ان سے نجات کے لیے پیروں فقیروں کے چُنگل میں پھنس جاتا ہے۔ اُسے اپنے پرائے کی تمیز نہیں رہتی۔ اس افسانے میں خاوند اپنی بیوی کو چڑیل تصور کرتا ہے۔ وہ اس واہمے کا شکار ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے سینے پر بیٹھ کر اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرتی ہے لہٰذا وہ اسے میکے بھجوا دیتا

ہے۔ یہ خوف کا ہیجان ہے جو شدّت کے ساتھ اس کے ذہن میں بیٹھ چکا ہے۔ کالے جادو میں ''ہانڈی اڑانا'' بھی ایک تکنیک ہے جس میں عامل جادو کا توڑ کرنے کے لیے'' کالی ہانڈی'' اُڑاتا ہے اور اگر ہانڈی بغیر کسی نقصان کے زمین پر بیٹھ جائے تو سمجھیں کہ عامل کا عمل کامیاب رہا اور جادو کا توڑ ہو گیا لیکن اِس افسانے کے اختتام پر ہانڈی زوردار دھماکے سے پھٹ جاتی ہے اور عامل اور اس کے چیلوں کو جَلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ اِس افسانے میں بے جا شک و شبہ کرنے والوں اور وہم و گمان کا شکار رہنے والوں کو سیدھا راستہ دکھایا گیا ہے اور جادو ٹونے اور تعویذ گنڈوں پر اعتقاد رکھنے والوں کو ان کی حقیقت سے آگاہ کیا گیا ہے جو انسان کی زندگی میں رخنے ڈال کر رشتوں کے درمیان نفرت اور بدگمانیاں پیدا کر دیتے ہیں۔ اِس افسانہ میں جاہل اور کم علم معاشرے کی توہمات، جادو ٹونے پر اعتقادات اور ذہنی نفسی الجھنوں کی غلط تعبیرات کے خلاف احتجاج کیا گیا ہے۔ افسانہ نگار مثبت سوچ کے ذریعے افرادِ معاشرہ کو اِن برائیوں سے نجات دلانے کے خواہاں ہے۔

یونانی اساطیر میں نارسس خود پرستی، خود پسندی اور خودستائی کی علامت ہے جس کا اظہار افسانہ ''جنم روپ'' میں کیا گیا ہے جس میں نارسس کی خود پسندی بھی ہے اور ناریوں، کنواریوں سے بے اعتنائی بھی۔ ایکو کا والہانہ پیار اور نارسس کی اس لاتعلقی کا ذکر بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ یونانی اساطیر میں نارسس کے حوالے سے رہا ہے۔ ''نارسس'' کے حوالے سے ابنِ حنیف لکھتے ہیں:

> یونانی تاریخ میں نارسس کا ذکر ایکو کی بدولت ملتا ہے۔ ایکو (Echo) انتہائی خوب صورت کوہستانی پری تھی، کچھ کہانیوں میں اسے پریوں میں سب سے زیادہ حسین قرار دیا گیا ہے۔ وہ زمین کی دیوی جیا ((Gaea کی بیٹی تھی۔ ایکو زیوس کی بیگم ''ہیرا'' دیوی کی مقرب باندی تھی اور زیوس کے بہت سارے معاشقوں کی رازدار بھی تھی۔ [۲۵]

ابنِ حنیف نارسس کی نرگسیّت اور اس کے انجام کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> نارسس اُلفتِ ذات کا شکار تھا۔ ایک دفعہ نارسس تالاب پر پانی پینے کے لیے جُھکا اور بے حد شفاف پانی میں اپنا چہرہ دیکھا اور خود پر عاشق ہو گیا۔ بعض روایات کے مطابق دراصل نارسس غرور کی بنا پر ارتمس دیوی یا انتقام کی دیوی نمس نے اسے سزا کے طور پر اپنے عکس سے جنوں کی حد تک مبتلا کر دیا اور وہ حد درجہ نرگسیّت کا شکار ہو گیا۔ [۲۶]

''جنم روپ'' نامی افسانے میں نارسس اپنی ذات کے ادھورے پن کی تکمیل چاہتا تھا اور یہ تکمیلِ ذات ایکو سے نہیں بل کہ اس کی اپنی نسائی روح سے ممکن تھی جو اُسے بار بار اپنی طرف بلاتی رہی۔ ایکو اسے ہر لحہ اپنی طرف لبھانے کے لیے کوشاں تھی لیکن نارسس نے سمندر کی لہروں میں گم ہو کر اپنے وجود کی تکمیل کر لی ہے۔ سمندر میں اس کا گم ہونا دراصل نسائی روح کے ساتھ مل کر تکمیلِ ذات کا درجہ پا لینا ہے۔ افسانہ میں موجود یہ جملے ملاحظہ کیجیے:

> دیوتاؤں نے ایسا اہتمام کیا ہے کہ دونوں روحیں، ایک تن میں ہونے کے باوجود، مل نہ پائیں، انسان اسی لیے عالمِ تضاد میں رہتا ہے۔ کسی وجود میں اگر یہ دونوں روحیں یک جا ہو جائیں تو انسان یکتا ہو جائے، ''دیوتا سمان'' امر ہو جائے۔ [۲۷]

ڈاکٹر سلیم اختر نے ''جنم روپ'' میں نارسس (نرگس) کی اصطلاح کو خوب صورت لفظی پیکر میں ڈھال کر مرد و عورت کی باہمی تکمیل کی نفسیاتی حقیقت، افسانوی اسلوب میں سمجھا دی۔ اِس نظریے کے تحت نارسس سمندر میں ڈوب کر، نسائی روح (Anima) کے ساتھ مل کر اپنی وحدت کی تکمیل کر لیتا ہے جب کہ ایکو سمندر کے کنارے نمودار ہونے والے پھول جس سے نارسس کے بدن کی خوشبو آتی ہے، پر فریفتہ ہو جاتی ہے اور اس سے نارسس کی بے اعتنائی کے گلے اور ہجر کی کلفتوں کا تذکرہ کرتی ہے۔ افسانے کی بُنت، خوب صورت منظر کشی، واقعات کا ربط و تسلسل اور متحرک کردار نگاری کی بِنا پر افسانے کی تاثیر اور دل کشی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر قاضی عابد اِس افسانے پر یوں تبصرہ کناں ہیں:

> کہانی کا اصل حسن دراصل اس ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کے اندر ہے جو نارسس اور ایکو کے اندر جنم لیتی ہے اور یہی چیز تخلیقی سطح پر اس کہانی کو سلطان حیدر جوش کے ''نرگسِ خود پرست'' اور عزیز احمد کے ''آبِ حیات'' کے نارسس والے سے ممتاز کر دیتی ہے۔ نفسیات کے علم کو عملی سطح پر بَرت کر اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کو بھرپور انداز میں ظاہر کیا گیا ہے۔ [۲۸]

ڈاکٹر سلیم اختر کے اساطیری افسانوں میں متنوع اساطیری عناصر مثلاً بھوت، چڑیل (Vampire)، سانپ، جنگل، پراسرار درخت، تاریکی، اماوس کی رات، نارسس کی خود پسندی، جادو ٹونے اور تعویذوں کا ذکر دراصل وہ علامات ہیں جو ہمارے اجتماعی لاشعور کا لازمی جزو ہیں اور نسل در نسل فروغ پا کر تہذیبی زندگی کا حصّہ بن چکی ہیں۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> جنگل، تاریکی، سایہ، بھوت، چڑیلیں، سانپ، پراسرار درخت وغیرہ ہمارے اجتماعی لاشعور کے archetypes ہیں اور ان کا سلسلہ ہمارے ان بعید ترین آبا سے جا ملتا ہے جنھوں نے پہلی مرتبہ دو قدموں پر کھڑے ہو کر، گردن گھما کر ارد گرد پھیلے وحشت ناک ماحول کا جائزہ لیا۔۔۔ یہ بعید ترین آبا قریہ خوف میں زیست کرتے تھے کہ ان کی تاریکی، گرج، چمک، سانپ، خون، مردہ خوف پیدا کرنے والے تھے۔ انسانی خوف اور اس کے متنوع مظاہر سے چھٹکارا نہ پا سکا اور آج بھی نائٹ میئرز کی صورت میں وہ اس کا تجربہ کرتا ہے۔ انفرادی پیتا اور اجتماعی ابتلا کی صورت میں آج بھی ان کا تجربہ کیا جا سکتا ہے۔ [۲۹]

اساطیری ادب کے وسیع مطالعے اور دل چسپی کی بدولت، ڈاکٹر سلیم اختر نے خوب صورت، مکمل اور جامع پیکر تراشے ہیں۔ مافوق الفطرت کرداروں کا عمل و ردِعمل، قاری میں تجسّس و تحیّر کا مادہ بیدار کر دیتا ہے اور جب یہ کردار چلتے پھرتے، ہنستے روتے اور غیض و غضب کا مظاہرہ کرتے ہیں تو قاری کے اندرونی جذبات کی تنقیہہ بھی ہو جاتی ہے۔ تخیّل کی وسعت اور کفایتِ لفظی اس پر مستزاد؛ بقول ڈاکٹر صغرا صدف:

> لگتا ہے ان کے پاس کوئی گدڑ سنگھی یا جادوئی چھڑی بھی ضرور ہے کہ وہ جب چاہتے ہیں انسانی شکل کا پیرہن اتار کر چار ٹانگوں والی کسی مخلوق کا جسم، اس کے خیالات سمیت اوڑھ لیتے ہیں اور اس کی کہانیاں بیان کرنے لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ جامد اور پتھر کی بنی ہوئی مورتیوں میں سرایت کرنا بھی انھیں خوب آتا ہے۔ انھیں احساسات و خیالات کے ساتھ ذات پر بھی ہر قسم کی قدرت حاصل ہے۔ جب جی چاہا، ذات کے مکان کا دروازہ کھولا، کوئی روپ دھارا اور کسی ان دیکھی دنیا کے سفر پر چل دیے اور واپسی پر کھوج کا سارا حوال افسانے کی صورت میں لکھ دیا۔ [۳۰]

حوالہ جات

۱۔ ابن منظور،لسان العرب، بیروت، جلد چہارم، س۔ن ۲۶۳۔

۲۔ میلی نووسکی، انسائیکلو پیڈیا بر ٹا نیکا(چودھواں ایڈیشن)نیویارک:ریلجن میک ملن پبلشنگ کمپنی، ۱۹۸۷ء، ۱۶۲۔

۳۔ قاضی عابد، ڈاکٹر''اُردو کا پہلا اساطیری افسانہ''مشمولہ، پاکستانی ادب(حصہ نثر)۲۰۰۴ء، مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۵ء، ۵۴۔

۴۔ سلیم شہزاد''اساطیر کا جمالیاتی مطالعہ''مشمولہ، ماہنامہ ایوانِ اردو، دہلی، اپریل ۲۰۱۱ء، ۷۔

۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نشانِ جگر سوختہ(آپ بیتی)، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۴ء، ۲۷۔

۶۔ ایضاً، ۲۲۔۳۲۔

۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر''زیوس سے امیر حمزہ تک''مشمولہ داستان اور ناول(تنقیدی مطالعہ)، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ۸۲۔

۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر''ادب اور عصری آگہی: افسانہ''مشمولہ افسانہ اور افسانہ نگار: تنقیدی مطالعہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ۴۳۔۷۔

۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر''آئس برگ: مَیں افسانہ کیوں کر لکھتا ہوں''مشمولہ، سہ ماہی، سورج، لاہور، شمارہ نمبر۴، ۲۰۰۶ء، ۹۔

۱۰۔ ابنِ حنیف، بھولی بسری کہانیاں یونان، ملتان: بیکن بکس، ۱۹۹۲ء، ۲۰۳۔۲۰۴۔

۱۱۔ ''قفسِ رنگ''، مشمولہ، نرگس اور کیکٹس(افسانوی کلیات)، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ۱۰۔

۱۲۔ ''قفسِ رنگ''، مشمولہ، نرگس اور کیکٹس، ۸۱۔

۱۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر''زیوس سے امیر حمزہ تک''، مشمولہ، نگاہ اور نقطے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ۴۲۔

۱۴۔ نجیب جمال، ڈاکٹر''ڈاکٹر سلیم اختر کی افسانہ نگاری''مشمولہ، ڈاکٹر سلیم اختر: شخصیت و تخلیقی شخصیت، ڈاکٹر طاہر تونسوی(مرتب)، لاہور: گورا پبلشرز، ۲۵ لوئر مال، ۱۹۹۵ء، ۳۵۳۔

۱۵۔ ''شکتی''، مشمولہ نرگس اور کیکٹس، ۴۴۷۔

۱۶۔ صباح، مقبول حسین''ڈاکٹر سلیم اختر کے کڑوے بادام''، مشمولہ ڈاکٹر سلیم اختر: شخصیت و تخلیقی شخصیت، ۴۵۵۔

۱۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نشانِ جگر سوختہ (آپ بیتی)، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ۴۴۱۔

۱۸۔ ''اماوس''، مشمولہ، نرگس اور کیکٹس، ۴۴۱۔

۱۹۔ ابنِ حنیف، بھولی بسری کہانیاں بھارت، ملتان: بیکن بکس، ۲۰۰۰ء، ۱۳۸۔

۲۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، عجب سیر تھی (سفرنامہ)، لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ، باراوّل، ۲۰۰۳ء، ۳۵۔۳۶۔

۲۱۔ اشرف، اے بی، ڈاکٹر، شاعروں اور افسانہ نگاروں کا مطالعہ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ۴۳۳۔

۲۲۔ ابواللیث، صدیقی، ڈاکٹر، غزل اور متغزلین، لاہور: مطبوعہ اردو مرکز، ۱۹۵۴ء، ۲۹۔

۲۳۔ مولانا حسن نظامی، دہلوی، تاریخ فرعون، ص: ۱۸۹ بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر، ہماری جنسی اور جذباتی زندگی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء، ۱۲۵۔۱۲۶۔

۲۴۔ ہماری جنسی و جذباتی زندگی، ۱۲۶۔

۲۵۔ ابن حنیف، بھولی بسری کہانیاں یونان، ملتان: بیکن بکس، ۱۹۹۶ء، ۱۰۰۹۔

۲۶۔ ایضاً، ۱۰۱۰۔

۲۷۔ ''جنم روپ''، مشمولہ، نرگس اور کیکٹس، ۹۳۔

۲۸۔ قاضی عابد، ڈاکٹر، اُردو افسانہ اور اساطیر، ملتان: شعبہ اُردو زکریا یونی ورسٹی، ۲۰۰۲ء، ۲۳۳۔

۲۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تخلیق اور لاشعوری محرکات، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ۲۰۴۔

۳۰۔ صفر اصدف، ڈاکٹر، ''خوش بخت قلم کار: ڈاکٹر سلیم اختر''، مشمولہ، ماہنامہ، وجدان، لاہور جلد نمبر ۱، شمارہ نمبر ۱۷، مارچ ۲۰۰۹ء، ۲۶۔